رُوحانی اُستاد

شہود احمد مودی

بُنیادی طور پر ہم ایک جھگڑالو معاشرے کے فرد ہیں۔ جس طرح قیامِ پاکستان کے ۳۳ برس بعد بھی آج تک سیاستدانوں کے درمیان یہ جھگڑا طے نہیں ہو سکا کہ نظریۂ پاکستان کیا تھا، اسی طرح ادب کے ٹھیکیداروں کے درمیان یہ جھگڑا طے نہیں ہو سکا کہ جاسوسی کہانیوں کو ادب میں شمار کیا جائے یا نہیں، ابنِ صفی، میرے رُوحانی اُستاد اس لحاظ سے دانشمند تھے، کہ انہوں نے اس جھگڑے کو کبھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور خلوصِ نیت کے ساتھ زندگی بھر اپنا کام کرتے رہے۔

آج سے بیس برس پہلے کی بات ہے، میں دوسری جماعت میں تھا جب میں نے اُن کا پہلا ناول پڑھا تھا اور اس کے بعد سے آج تک اُن کی ہر کتاب پڑھی۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اُنہی کی تحریروں کا اعجاز تھا جو آج میں کچھ قلم گھسیٹنے کے قابل

ہُوں اور اسی قلم سے روزی کماتا ہُوں اور صرف مجھے ہی نہیں، اس شجرِ سایہ دار سے نہ جانے کتنے لوگوں کو کیا کیا فیض پہنچے۔ سینکڑوں فلم کاروں نے اُن کے تخلیق کردہ کرداروں کو مستعار لے کر اپنا کیریئر بنایا، بیسیوں پبلشروں نے اُن کے نام کے ساتھ نقطوں کی ہیرا پھیریاں کر کے دولت کمائی اور بیسیوں بدخواہوں نے اس درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر اس کی جڑیں کاٹنے کی کوشش کی مگر اس درویش صفت انسان کا مقام اس سے کوئی بھی نہ چھین سکا۔

مارچ ۱۹۸۰ء میں میری اُن سے پہلی اور آخری مُلاقات اُن کی رہائش گاہ پر ہوئی۔ اُن کے دیرینہ رفیق شکیل جمالی بھارت سے آئے ہُوئے تھے۔ مسلسل بیماری نے ابنِ صفی صاحب کا جسم لاغر کر دیا تھا مگر ذہن روزِ اوّل کی طرح شگفتہ تھا۔ میرا اُن سے تعارف کرایا گیا تو مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ مجھے جانتے ہوں گے لیکن انہوں نے صرف میرا نام سنتے ہی اپنائیت سے میرا کندھا تھپکا اور شکیل جمالی صاحب کو بتانے لگے۔ "بھئی یہ اس نوجوانی میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور بہت اچھا لکھ چکے ہیں۔" یہ میری زندگی کا قیمتی ترین تبصرہ ہے جو میری یادوں کے نہاں خانوں میں ہمیشہ محفوظ رہے گا۔ مجھے اپنے لکھے کا اس سے بڑا معاوضہ کچھ نہیں چاہیے کہ میرے رُوحانی اُستاد نے مجھے پہچانا اور کام کے حوالے سے میری ہمت افزائی کی۔

میں نے اُنہیں بتایا۔ "میں آپ کو رُوحانی اُستاد مانتا ہُوں" انکسار سے سر جُھکا کر بولے۔ "میاں کیوں شرمندہ کرتے ہو۔"

ابھی تو میں اس انمول ملاقات کی خوشی سے صحیح طور پر

محفوظ بھی نہ ہونے پایا تھا کہ روزنامہ "مشرق" لاہور میں راشدہ ثناء کا کالم نظر سے گزرا جو انہوں نے صفی صاحب کے انتقال پر خوبصورت پیرایۂ اظہار میں اپنی عقیدت کو سمو کر لکھا تھا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ ابنِ صفی اس دُنیا سے رُوٹھ گئے ہیں۔ لاہور کے اخباروں میں اُن کے انتقال کی خبر نظر سے نہیں گزری تھی۔ بعد میں دوستوں نے بتایا کہ نہایت غیر نمایاں انداز میں چھپی تھی۔ مجھے کوئی حیرت نہ ہوئی۔ قدر ناشناسوں کے اس جنگل میں اگر چند ایڈیٹروں کو اپنے تعصب یا کم علمی کی وجہ سے ابنِ صفی کے قد کا اندازہ نہیں ہو سکا تو اس سے اُن کی حیثیت تو نہیں گھٹی۔ ہاں اُن دلوں میں ہلکی سی کسک ضرور اُبھری ہوگی جن دِلوں میں ابنِ صفی کا نام زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔ جیسا کہ میں نے شروع میں لکھا ہے کہ ہم بُنیادی طور پر ایک جھگڑالو معاشرے کے فرد ہیں۔ چنانچہ جاسوسی ادب اور "خالص ادب" کا جھگڑا ابنِ صفی کی موت کے بعد بھی چلتا رہے گا۔ اُونچے درجے کے کچھ بیوروکریٹس ناک سُکیڑ کر فرماتے رہتے ہیں کہ جاسوسی لٹریچر جرائم کے رجحان کو فروغ دیتا ہے۔ یا تو ان بیوروکریٹس اور جغادری ادیبوں کو جوانی میں پڑھی ہُوئی جاسوسی کہانیوں کے پلاٹ یاد نہیں رہے یا دُوسرے معاملوں کے ساتھ ساتھ ادب کے معاملے میں بھی اُن کی بینائی کمزور ہے۔ جاسوسی کہانیوں میں مجرموں کا جو حشر ہوتا ہے اُسے پڑھ کر مستقبل میں جُرم کی خواہش رکھنے والا اگر اپنے ارادے سے تائب نہ ہو تو اس معاشرے میں جرائم کی شرح کم از کم دس گنا زیادہ ہو جائے۔ یہ جو دیہاتوں میں چٹے ان پڑھ ایک بگھہ زمین کے پیچھے پُورے پُورے گھرانوں کو زندہ جلا دیتے ہیں، یہ بدنام ڈاکو جنہوں نے اسکول کی شکل نہیں دیکھی ہوتی، چرس، افیم کے بیوپاری اور عصمتوں کے لٹیرے جنہوں نے اپنے مقدموں کی الف آئی آر کے علاوہ زندگی میں کوئی چیز غور سے نہیں پڑھی ہوتی کیا یہ سب آپ کے خیال میں جاسوسی ناولیں پڑھ کر جُرم کرتے ہیں؟ اگر میں جرائم کے اصل اسباب اور مجرموں کی دیدہ دلیری کی حقیقی وجوہ بیان کرنے بیٹھوں تو نہ صرف بات طویل ہو جائے گی بلکہ بہت سی "اونچی" پیشانیوں پر بَل آجائے گا۔ ہم تو ویسے بھی رعایا ہیں، ہمارا کام احکامات اور فتووں پر سرِ تسلیم خم کرنا ہے، نکتہ چینی ہماری سرشت میں نہیں ہونی چاہیے۔

ابنِ صفی صاحب! آپ نے بہت اچھا کیا جو جھگڑوں اور تضادات کے اس معاشرے سے دُور چلے گئے ورنہ ابھی نہ جانے کب تک جغادری ادیبوں، افسروں اور مصلحوں نے آپ کی کتابیں تکیوں تلے چھُپا چھُپا کر رکھنی تھیں لیکن ادبی مجلسوں، میٹنگوں اور مذاکروں میں بڑھ چڑھ کر جاسوسی ادب کو بُرا بھلا کہنا تھا۔ آپ کے فن کو یہی خراج کافی ہے کہ پاکستان کا ہر پڑھا لکھا شہری آپ کو جانتا ہے۔ آپ کے اس دُنیا سے اُٹھنے پر لاکھوں دل سوگوار ہیں، آپ کی آیندہ کتاب کی منتظر لاکھوں آنکھیں اشکبار ہیں۔

آپ کی کتابوں کے پورے پورے سیٹ لوگوں کی نجی لائبریریوں میں سجے ہوئے ہیں اور آپ کا نام اَن گنت ذہنوں پر پتھر کی لکیر کی طرح کندہ ہے۔ شاید آپ کے دل میں یہ خواہش رہی ہو کہ کبھی پولیس افسر اور سُراغرساں بھی آپ کی کتابوں سے کچھ سیکھیں، جاسوسی ادب کے لیے بھی ہمارے ہاں ایوارڈ تقسیم ہوں، محکموں کے سربراہوں کے دلوں میں بھی فرض شناسی اور قوم پرستی کا وہ جذبہ پیدا ہو جو آپ کے ناولوں کے ہیروز کے دلوں میں نظر آتا ہے۔ اس قسم کی خواہشوں کی تکمیل کے لیے آپ کو نہ جانے کتنا طویل انتظار کرنا پڑتا۔ اس انتظار کا شاید کوئی اختتام ہی نہ ہوتا۔ اس لیے آپ نے اچھا کیا جو دُنیا ترک کر دی۔ حق کے لیے لڑتے لڑتے آپ کے جسم سے لہُو نچڑ گیا تھا، آپ کے اعصاب تھک گئے تھے۔ آپ کو آرام کی ضرورت تھی۔ آپ نے زندگی کے آخری لمحوں تک کام کیا ہے اور ایک بہادر کی یہی شناخت ہوتی ہے۔ ہمارا کیا ہے، ہماری آنکھیں تو رونے کی عادی ہیں۔ ہم نے اپنے بہت سے پیاروں کی موت کے صدمے سہے ہیں۔ آپ کی جُدائی میں بھی ہماری آنکھیں نم اور دل محزوں و افسُردہ رہیں گے مگر رفتہ رفتہ قرار آجائے گا۔ رُوح بہت ڈھیٹ ہو چکی ہے کہ اس کا ہر زخم رفتہ رفتہ بھر جاتا ہے مگر یقین رکھیے ہم آپ کی جُدائی کا صدمہ شاید بھُول جائیں لیکن آپ کو نہیں بھُولیں گے۔ آپ سے جو کچھ سیکھا ہے اُس سے مُنکر نہیں ہوں گے، زندگی کا جو قرینہ آپ نے سکھایا ہے اس پر آپ کے شکر گزار رہیں گے۔ معلوم نہیں وہ کون کور چشم ہیں جو کہتے ہیں کہ جاسُوسی کہانیاں جُرم سے رغبت سکھاتی ہیں۔ ہم نے تو آپ کی کتابوں سے جُرم سے نفرت کا سبق سیکھا ہے۔ ہمیں ان کتابوں میں قوم کا وہ درد ملا ہے جو سیاستدانوں کے دلوں میں نہیں ہے۔ ہمیں ان کتابوں میں احساسِ فرض کی وہ روشنی ملی ہے جو نگہبانوں کے دلوں میں نہیں ہے۔ ہمیں ان کتابوں میں وہ فلسفۂ حیات ملا ہے جو مشہور مفکروں کی تحریروں میں نہیں ہے۔ ہمیں ان کتابوں میں وہ چاشنی اور تاثیر ملی ہے جو گل و بلبل کے افسانوں میں نہیں ہے۔ معلوم نہیں لوگ

آپ سے اور کیا چاہتے تھے ؟

ابنِ صفی صاحب! ہم تہی دست و کم مایہ لوگوں کے پاس آپ کے لیے صرف جذبوں، عقیدتوں اور چاہتوں کا سرمایہ تھا، وہ ہم نے آپ کی نذر کر دیا۔ اگر ہماری چاہت میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو ہمیں معاف کر دیجیے گا کہ ہماری پونجی اس سے زیادہ نہ تھی۔

وہ لوگ جنہیں قلم چلانا آتا ہے اور جنہیں چھپنے کے ذرائع میسّر ہیں وہ تو آپ سے اپنے تعلّقِ خاطر اور وابستگی کے اظہار کے لیے بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور لکھتے رہیں گے لیکن مجھے ان لاکھوں گمنام چاہنے والوں کا خیال افسُردہ کر رہا ہے جن سے آپ کا صرف کتاب کا ناتا تھا۔ اُن کے جذبات صرف خطوں کے انباروں کی صورت میں آپ کے دفتر میں پڑے رہ جائیں گے۔ آپ اتنی دُور چلے گئے ہیں کہ جہاں خطوں کی رسائی نہیں۔ آپ کو یہ تو معلوم ہی تھا کہ لوگ آپ کو کتنا اور کس طرح چاہتے ہیں، مگر آپ کے رخصت ہونے کے بعد جیسے جیسے جگر خراش نامے لکھے اور اُن لکھے اس دُنیا میں رہ گئے ہیں، اگر آپ انہیں پڑھ پاتے تو شاید خود آپ کی آنکھیں بھی نم ہو جاتیں۔ مگر ان آنسوؤں میں خوشی کا یہ احساس بھی شامل ہوتا کہ اتنی چاہت اور اتنی عقیدت کسی کسی ہی کا مقدّر ہوتی ہے۔